لۆبدت

تزئین
شِو سنگھ

طبعِ اوّل : ایک ہزار ایک سو
ماہ وسالِ اشاعت : جنوری ۱۹۷۹ء
خوشنویس : محمد ایوب شاہجہانپوری
مطبع : ہمدرد آفسیٹ پریس - جالندھر
قیمت : ۲۰ روپے

(یہ کتاب حکومتِ پنجاب کے مالی اشتراک سے شائع ہو رہی ہے)

ناشران
مکتبۂ مُنیر - ۶۳ ماڈل ٹاؤن - ہوشیار پور

ملنے کا پتہ
شب خون کتاب گھر - ۳۱۳ رانی منڈی اِلہ آباد

اپنی بیوی کے نام

چاروں طرف بچھائے گا پانی کی چادریں
ایسا کہاں کا وہ جو فریبِ سُراب دے

فہرست

پیش لفظ

پریم کمار نظرؔ کا زیرِ نظر مجموعہ کلام اُس لوحِ بدن کا منظر پیش کرتا ہے
جس پر فطرت نے کوئی عبارت نہ لکھی کیونکہ فطرت تو چہکار، خوشبو اور لمس
کی زبان میں بات کرتی ہے، لفظوں کے ذریعے نہیں ـــــ مگر اسی لوحِ
بدن کو شاعر نے فطرت کے ہاتھوں سے چھین کر اس پر عبارت لکھ دی اور یوں
بدن کو بدن کی سطح سے اُوپر اُٹھا کر وسیلۂ اظہار کی سطح پر لے آیا۔ بس یہی
پریم کمار نظرؔ کی انفرادیت ہے کہ جس طرح اجنتا اور ایلورا کے بُت تراشوں نے
پتّھر کو اظہارِ جذبات کا وسیلہ بنایا اُسی طرح پریم کمار نظرؔ نے بدن کو اپنے
لطیف احساسات کی ترسیل کے لئے ایک ذریعہ متصوّر کیا۔

پتّھر کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ بُت تراش اسے زبان کی
حیثیت عطا کرتا ہے۔ اور گو بدن کی اپنی ایک زبان ضرور ہوتی ہے
جسے وہ خوشبو اور لمس میں متشکّل کرتا ہے تاہم اگر شاعر بدن ہی کو
ذریعہ بنانے پر مُصر ہو تو پھر وہ اس پر اپنی عبارت کندہ کرتا ہے اور

یہ عبارت بدن کے لہو سے مشتعل ہو کر ایک عجیب سی تابناکی اور درخشندگی
کا مظاہرہ کرتی ہے۔

اُردو غزل کے بارے میں ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ خون
کی کمی کا شکار ہے اور یہ بات غلط نہیں، کیونکہ ہماری غزل نے ماورائیت
اور تجریدیت میں ڈوب کر بدن سے غذا کشید کرنے کے عمل ہی کو فراموش
کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک شکایت یہ بھی عام ہے کہ بعض اوقات
اُردو غزل نے خود کو بدن کے حصار میں پوری طرح قید کر لیا اور اُس پر
ارضیت پوری طرح غالب آگئی۔ گویا شاعر نے بدن کو اظہار کا وسیلہ بنانے
کے بجائے بدن کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی اور اس لئے لمس
اور خوشبو کی سطح سے اُوپر نہ اُٹھ سکا۔ پریم کمار نظر کا رویہ ان دونوں صورتوں
سے مختلف ہے۔ کیونکہ نہ تو اُس نے بدن اور اس کے چہکتے بولتے
لہو سے خود کو محروم کیا ہے اور نہ ہی خود کو اُس کا مطیع ہونے کی
اجازت دی ہے۔ اس کے سامنے بدن ایک لوح کی طرح ہے جس پر
وہ اپنے مخصوص انداز میں عبارت کے حروف کو اجاگر کرتا ہے اور
یہ حروف اس کے لطیف احساسات سے ہم آہنگ ہو کر ایک
انوکھے ملکوتی نغمے میں ڈھل جاتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ شاعر

کے بطون کی روشنی سے متنیز ہوتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پریم کمار نظر کی غزلوں کو محض اسی ایک زاویئے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حقیقتاً یہ ہے کہ ایک اچھے شاعر کا کلام تو اَن گنت شعاعوں کا انعکاس کرتا ہے اور ان میں ہر شعاع ـــــ دامنِ دل می کشد جا انجاست۔ تاہم شاعر کے ہاں ایک بنیادی جہت بھی ہوتی ہے جو اس کے روحانی سفر کی نشاندہی کرتی ہے۔ پریم کمار نظر کے ہاں یہ جہت لوحِ بدن پر لکھی گئی عبارت ہی سے اُجاگر ہوتی ہے لہٰذا اس مختصر سے پیش لفظ میں میں نے سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔

(ڈاکٹر) وزیر آغا

سرگودھا
۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء

دیباچہ

عرصہ ہوا میں نے لکھا تھا کہ ہمارا عہد عشقیہ شاعری کو راس نہیں آتا۔ میں اس رائے پر اب بھی قائم ہوں، لیکن یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ہمارا عہد غزل کو راس آرہا ہے اور غزل بہرحال بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔ پھر اس تضاد کو کیوں کر حل کروں؟ لیکن اس کو حل کرنے کی مصیبت میں کیوں مول لوں، جب خود غزل کے شاعروں نے ہی یہ مسئلہ بڑی حد تک صاف کر دیا ہے۔ غزل کے وہ شاعر جو رسمی عشقیہ جذبات تک محدود رہتے ہیں اور جن کے یہاں عشق کا تجربہ محض دو اور دو چار کی سطح پر بیان ہوا ہے (چاہے اس سطح پر بہ ظاہر کتنا ہی تنوع کیوں نہ ہو اور اوپر اوپر بڑی جرأت مندانہ باتیں کہی گئی ہوں) نہ صرف یہ کہ اچھی غزل نہیں کہہ رہے ہیں، بلکہ

وہ ایسی غزل بھی نہیں کہہ رہے ہیں جسے دراصل ہمارے زمانے کی غزل (یعنی عشقیہ شاعری) کہا جا سکے۔ یہ بات تو اب ہندی اور بنگالی کے شاعر بھی جان گئے ہیں کہ محض عضو تناسل، پستان، مساس، انزال اور اس طرح کی دوسری باتیں کر کے نئی عشقیہ شاعری نہیں ہو سکتی۔ جنسی، سطحی، دکھاوے کی شاعری تو ہو سکتی ہے لیکن عشق کے تجربے کو آج جس نہج سے ہم برتنا چاہتے ہیں وہ یہ نہج نہیں ہے۔ جنس سستی ضرور ہو گئی ہے، بقول جان فاؤلز (JOHN FOWLES) ہمارے عہد نے عشق کی تخفیف قدر کر کے نفرت کی بھی تخفیف قدر کر دی ہے۔ اب نہ کوئی کسی پر مرتا ہے اور نہ کسی سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اس کو دیکھنے کا بھی روادار نہ ہو۔ غزل کی چھوٹی موٹی لیکن اصلی اور سچی عشقیہ شاعری کے لئے دور نہ جائیے، میر حسن کو سنئے ؎

عِشق کا راز گر نہ کھُل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا
اور ترا اختلاط ہر اک سے
کیا کریں ہم کو خوش نہیں آتا

اب اس طرح کی شاعری نہیں ہو سکتی۔ لیکن روس کی غیر معمولی

بلکہ اعجاز نما عشقیہ شاعر انیا آخمتووا (ANNA AKHMATOVA) اس طرح ضرور لکھ سکتی ہے :

اور تب ہم جان لیتے ہیں، اور یہ جان کر بیزار بھی ہوتے ہیں کہ اگر کبھی اتفاقیہ، کسی طرح، مرے ہوئے لوٹ آئیں تو ہم انھیں پہچانیں گے نہیں۔ اور وہ چند برگزیدہ عزیز جن سے خدا نے ہم کو جدا کرنا پسند کیا، ہمیں یاد نہیں کرتے، اور یہ کہ یہ اسی طرح بہتر ہے کہ یہ سب کچھ بہ ظاہر غیر فطری طور پر سہی لیکن بہتری کے لئے ہے۔

میری مراد یہ ہے کہ اب نہ برہ میں جھلسنے والی غزل چل سکتی ہے اور نہ کھلی ننگی جنسی غزل چل سکتی ہے۔ معشوق کا رومانی احساس جو اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کی بنیادی صفت ہے، اب ہمارے زمانے میں نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے بعض لوگ اب بھی اس احساس سے دوچار ہوتے ہوں، لیکن اس کا تذکرہ کرنے میں جھجک محسوس ہونا فطری ہے، کیوں کہ جس زمانے میں اکثر چیزوں، اور خاص کر ایسی چیزوں، اور خاص کر اکثر اچھی چیزوں کی اصلیت پر شبہ عام ہو، معشوق کا رومانی احساس تو اب اسی طرح بیان ہو سکتا ہے جیسا ظفر اقبال کے یہاں ہے ؎

آیا تھا گھر سے ایک جھلک دیکھنے تری
میں کھو کے رہ گیا ترے بچوں کے شور میں

رہا سوال کھلی ننگی جنسی شاعری کا، تو اسے بھی ہمارے بزرگوں نے خوب خوب برت لیا ہے۔ اب اسے برتنا ہو تو طنز اور زبردستی کی بوالہوسی، نامردی اور اس کی پیدا کردہ دلچسپی اور اکتاہٹ، ان چیزوں کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ لوگ جو قبل از بلوغ کی ذہنیت میں مبتلا ہیں، ان کے لئے تو ممکن ہے کہ وہ ہوس یا جنس کا رزمیہ لکھنے کی کوشش کریں (اچھا ہے اس رزمیے میں ان کا ہی المیہ کیوں نہ جھلک جائے) ورنہ معاصر دنیا کے تجربے، واقعی اور اصلی تجربے، کے بعد جو عشقیہ شاعری ہوگی وہ معشوق کے رومانی اور روحانی احساس سے گریزاں ہوگی، لیکن محض اس کے جسم میں بھی الجھی ہوئی نہ ہوگی۔

غزل سراسر عشقیہ شاعری ہو یا نہ ہو لیکن سراسر غنائی (نہایت مہمل لفظ ہے لیکن LYRICAL کے لئے اور کوئی لفظ ہماری زبان میں نہیں ہے) شاعری ضرور ہے۔ اور غنائی شاعری کے مسائل دنیا کے تمام شاعروں کو پچھلے سو برس سے (یعنی جب سے بودلیئر نے یہ دریافت کیا کہ بدصورتی بھی حسن ہے اور بدی بھی نیکی ہے اور جب سے فلسفۂ زبان کے مفکروں نے معلوم کیا کہ شاعری، خاص کر جدید شاعری کا بنیادی مسئلہ زبان کا مسئلہ ہے۔ تفصیل

کے لئے ملاحظہ ہو رولاں بارت کی مختصر کتاب WRITING

DIGRE ZERO) پریشان کرتے رہے ہیں، کیوں کہ وہ لوگ بھی
اس مخمصے میں گرفتار تھے اور ہیں جو ہمارا آپ کا مخمصہ ہے، یعنی بقول
گر یہم ہف "نئی حسیت اور احساس کے قدیم طریقوں میں تناؤ اور کشاکش
کا احساس پچھلے سو برسوں کے شعراء میں جتنا واضح رہا ہے اتنا ہمارے
تمدن کے کسی اور عہد میں نہیں رہا۔" انیسویں صدی کے آخر تک شاعروں
کو محسوس ہونے لگا کہ معشوق سے گفتگو کرنا (حکایت با یار گفتن) ہمیشہ
کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ ایک وقت تھا کہ شاعر کہتا تھا "میں کچھ نہیں
بولتا، پھر بھی تم مجھے سن لیتی ہو" اور ایک وقت آیا جب اس نے کہا
"خاموشی ہی بہتر ہے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دیر تک یہی تمنا کرتے
رہیں کہ کاش باتیں بے کہی رہ جاتیں۔" احمد مشتاق نے اس سے ملتا جلتا
خیال یوں ادا کیا ہے ؎

دل بھر آیا کاغذِ خالی کی صورت دیکھ کر
جو تھیں کہنے کی وہ باتیں سب زبانی ہو گئیں

یعنی جن باتوں کو لکھ کر کہتے تھے اور اس طرح ان کو مستحکم کرتے تھے، اب
وہی باتیں رواروی میں زبانی کہہ دی جاتی ہیں۔ اب ان میں وہ وقعت

باقی نہیں رہ گئی۔ لہٰذا غزل کا شاعر اب عشق کے ان تجربات کی تلاش میں ہے، جو کسی نہ کسی طرح اس کی شخصیت کی اصلیت کو برقرار رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب میر حسن تو کیا ناصر کاظمی جیسی شاعری بھی نہیں ہو سکتی ؎

دفعتہً دل میں تری یاد نے لی انگڑائی

اس خرابے میں یہ دیوار کہاں سے آئی

اس مسئلے کو ظفر اقبال اور بانی نے اپنی اپنی طرح حل کیا ہے۔ اور آج کوئی شاعر ان دونوں (یا ان میں سے کسی ایک) کے دریافت کردہ راستوں سے آشنا ہوئے بغیر اپنی راہیں تلاش نہیں کر سکتا۔ بانی کی ایک تازہ غزل میں دو شعر یوں ہیں ؎

وہی ملاقات روبرو کی

دھواں خلش کا مہک لہو کی

چمک رہی ہے کوئی عجب شے

قیاس سے آگے جستجو کی

دونوں اشعار میں جنسی احساس، عشقیہ تجربہ اور ایک لطف انگیز کرب موجود ہے، یعنی ایک طرح کی دو احساسی (AMBIVALENCE) جو بہ یک وقت لطف اور کرب، خوشی اور رنج، محبت اور نفرت (یا کم سے کم

عدم محبت، اکتاہٹ) کو محیط ہے۔ پریم کمار نظر ابھی ان پیچیدگیوں سے آشنا نہیں ہوئے ہیں، ممکن ہے کبھی نہ ہوں۔ لیکن ان کے یہاں دو احساسی کا ایک نیا طرز دکھائی دیتا ہے، یعنی وہ عشقیہ احساس کے مسئلے کو اپنی طرح حل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ لفظ کی طرف ان کا رویہ ظفر اقبال اور بانی سے ملتا جلتا ہے (اگرچہ اپنے کم زور اشعار میں وہ اپنے سے کم زور ہم عصروں سے بھی متاثر نظر آتے ہیں) لیکن ان کے یہاں ظفر اقبال کی سی مہارت اور زبان کے ساتھ "بے ادبی" نہیں ہے جو ہمارے عہد میں اور کسی شاعر کے حصے میں اس قدر نہیں آئی۔ لیکن بے ادبی کا یہ وطیرہ انھوں نے معشوق کے جسم کے ساتھ ضرور اپنایا ہے۔ اس وطیرے میں ایک طرح کی نامردمردانگی ہے جو صرف ہمارے زمانے میں ممکن تھی ؎

مرے خیال میں چابک پسند تھا وہ جسم
یہ کیسی بھول ہوئی کھینچ لی نہ اس کی کھال

جی چاہتا ہے ہاتھ لگا کر بھی دیکھ لیں
اس کا بدن قبا ہے کہ اس کی قبا بدن

میں اپنی جامہ پوشی پر پشیماں
وہ اپنی بے لباسی پر فدا ہے
بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہیں
یہ کیسا کھُردرا بستر بچھا ہے

بدن کی اوٹ سے تکنے لگا ہے
وہ اپنا ذائقہ چکھنے لگا ہے
منڈیروں پر پرندے چہچہائے
پسِ دیوار پھل پکنے لگا ہے

وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا کہ پیش و پس میں ہے
بدن کا کرب تو ظاہر نفس نفس میں ہے
اگرچہ شور بہت کوچۂ ہوس میں ہے
وہ کیا کرے کہ جو چالیسویں برس میں ہے

بکھری ہوئی ہے ریت ندامت کی ذہن میں
اُترا ہے جب سے جسم کا دریا چڑھا ہوا

ان اشعار کی انفرادیت تجربے کی نسبتاً سادگی کے باوجود تجربے کی انفرادیت اور اس کے اظہار میں استعارے اور بالواسطہ بیان پر انحصار کے باعث نمایاں ہے۔ جس شخص نے یہ شعر کہے ہیں وہ ان میں سے بعض راہوں سے کسی نہ کسی طرح ہو کر گذرا ہے جو میر کو بھی عزیز تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پریم کمار نظر نے عشق کے ذریعہ حاصل ہونے والے کرب اور عرفان اور وسعتِ احساس کی وہ کیفیت حاصل کر لی ہے جو میر کا طرۂ امتیاز تھی کہ ع

عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں

لیکن وہ یقیناً ان منزلوں سے آگے ہیں جو میر کے دیوان چہارم کی اسی غزل کے اگلے شعر میں نظر آتی ہیں ؎

گوندھ کے پتی گل کی گویا وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

فرق یہ ہے کہ پریم کمار نظر چولی کے بھیگنے سے زیادہ اس کے مسکنے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دل چسپی معشوق کو نہ صرف جسم کی سطح پر برتنے کا نتیجہ ہے۔ میر کی اسی غزل میں ایک اور شعر قابل لحاظ ہے ؎

دل نہ ٹٹولیں کاش کہ اس کا، سردئ مہر تو ظاہر ہے
پاویں اس کو یار مبادا گرم ہمارے کینے میں

پریم کمار نظر کے یہاں کینے میں گرم معشوق کے بجائے اپنا ذائقہ چکھنے اور اس سے لذت گیر ہونے والا معشوق تو ہے، لیکن جو شخص اسے دیکھ رہا ہے، انگیز کر رہا ہے، اس کا ذکر کر رہا ہے، وہ میرؔ کی طرح تجربہ کار نہیں اور میر حسن کی طرح سادہ مزاج نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ شخص ہے جو ہوسناکی، عشق، نامردی اور نامرادی سب کو ایک ساتھ برت لیتا ہے۔

پریم کمار نظر کی غزل اپنے ہم عصروں میں کئی وجوہ سے ممتاز ہے، لیکن بنیادی مابہ الامتیاز یہی بات ہے کہ وہ جنس کے تجربے کی نہ تمجید کرتے ہیں اور نہ اسے سفلی سطح پر لے آتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں بھی نہیں ہیں جو چھپ چھپا کر گندی تصویریں دیکھتے ہیں اور شاعری میں ہجر و حرماں اور آرزو اور تمنا کے "معصوم" پردوں کے پیچھے اپنی گھٹن کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں عشق کے تجربے کو جنس کے تجربے سے الگ لیکن مماثل سمجھنے کا رجحان در اصل اس بات کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ اصل عشق تو حاصل ہوتا نہیں، جنس اسی نوع کی ایک چیز ہے لیکن اسے بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی تقدیس،

کوئی ماورائیت نہیں، یہ محض تفریح بھی نہیں۔ مگر ایک طرح کی لذت ضرور ہے، اس کے حصول میں کوئی اخلاقی رکاوٹ نہ ہونا چاہیے۔ لیکن ہندوستان کی حد تک جنس کی تقدیس کا رجحان آج بھی عام ہے (اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی میں اب بھی ایک طرح کا توازن باقی ہے۔) عورت کی طرف ہمکنے والے شاعر جنس کی تقدیس سے گریز کرتے ہیں لیکن وہ اسے کھلم کھلا لذت اور آبسی رشتوں کے ذریعہ بہ آسانی یا بے تکلف ہاتھ آنے کے قابل چیز سمجھنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ ایسے شعراء کے یہاں عشقیہ احساس کی خامی اور تجربے کی تنگ دامانی صاف نظر آتی ہے۔ پریم کمار نظر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جسم کی لذت اور اس لذت کے ذریعہ روح یا فرد کے ضیاع کے امکان کو بھی دیکھ لیا ہے۔ اگر وہ براہ راست احساس کی سطح پر شاعری کرتے تو ممکن تھا کہ تجربے کی یہ جہتیں ان پر روشن نہ ہوتیں۔ لیکن احساس کو محض انگیز کر لینے کے بجائے کسی نہ کسی موقعے پر، کبھی نہ کبھی وہ اس کا تجزیہ بھی کرنے بیٹھ جاتے ہیں ؎

قطرہ قطرہ لٹنے کا ایک خواب سا دیکھوں
دیر سے یہ خواہش ہے اپنا ذائقہ دیکھوں

پھر کھجوروں کے درختوں میں دھواں سا کِس لئے
آگ جب تاپی نہ تھی اور قافلہ ٹھہرا نہ تھا

مجھ کو ہر سمت سے آواز لگانے والے
حدِ فاصل بھی کوئی رکھ کہ ادھر جاؤں میں

کھولی نہ تھی کتاب کہ سب حرف مٹ گئے
اٹھی نہ تھی نگاہ کہ منظر سمٹ گیا

چاروں طرف بچھائے گا پانی کی چادریں
ایسا کہاں کا وہ جو فریبِ سراب دے

دیکھ آئے اس کو اور دیکھا نہیں
میری آنکھیں اب مرا حصہ نہیں

ان اشعار میں نارسائی یا ناکامی یا خاموشی کا تجربہ محض ایک شخص کے
حوالے سے بیان نہیں ہوا ہے۔ اس تجربے میں ایک طرح کا اسرار بھی

شامل ہے جو شاعر کی ذات کا حصہ ہے ۔ یہ اسرار اس لئے پیدا ہوا ہے
کہ شاعر بعض حوادث، بعض مظاہر سے واقف ہے لیکن وہ ان کے
اسباب سے نا آشنا ہے اور ان کو محض حقیقت کی سطح پر قبول کرتا
ہے، ان سے سوال و جواب نہیں کرتا ۔ قطرہ قطرہ لٹ جانے کا خواب
اپنا ذائقہ دیکھنے سے کس طرح مماثل ہے، اس قضیے کو حل کرنے کی
اسے فرصت یا ضرورت نہیں ۔ اس کو ہر سمت سے آوازیں آتی ہیں،
لیکن وہ اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ جس سمت جا رہا ہوں یا جس سمت جانا
ہے وہاں پہنچ کر میں خود کو ظاہر کروں گا یا معدوم کروں گا ۔ ممکن ہے یہ آوازیں
محض جسم کی آوازیں ہوں اور ناک، کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں کی سطح پر خود
کو ظاہر کرتی ہوں ۔ ممکن ہے یہ ماورائی آوازیں ہوں جو حدِ فاصل کے بغیر
بے معنی معلوم ہوتی ہیں ۔ لیکن دونوں صورتوں میں شاعر کی اپنی ذات خود
ایک پر اسرار تجربہ بن کر ظاہر ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پریم کمار نظر کے وہ
اشعار بھی، جن میں بہ ظاہر کوئی شخص اپنی تمام تنومند اور توانا کشش
کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ دوسری یا تیسری بار پڑھنے پر شخصیت سے
زیادہ تصوریت کے حامل نظر آتے ہیں ۔

اک شخص جس سے میرا تعارف نہیں مگر
گذرا ہے بار بار مجھے دیکھتا ہوا

میں بھی اس کے لئے اک حرفِ غلط ہوں شاید
خود ہی لکھتا ہے مجھے خود ہی مٹاتا ہے مجھے

رکھ دی ہے اس نے کھول کے خود جسم کی کتاب
سادہ ورق پہ لے کوئی منظر اتار دے

دوسرے اور تیسرے شعر میں حیرت انگیز داخلی مماثلت ہے، اگرچہ بظاہر دوسرا شعر مابعد الطبیعیاتی اور تیسرا شعر جمانیاتی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دونوں اشعار میں حرف، کتاب، ورق، لکھنا، مٹانا وغیرہ کے پیکروں کا مشترک ہونا معنی خیز ہے۔ جس سادہ ورق پر کوئی منظر اتارنے کی ترغیب ہے وہ بظاہر تو معشوق کا جسم ہے لیکن جس شخص کو منظر اتارنے کی ترغیب دی جا رہی ہے وہ خود حرف غلط کی طرح کسی اور کے ہاتھوں بنتا مٹتا رہتا ہے۔ اس طرح ظاہری جسم دراصل داخلی تصور کا عکس معلوم ہونے لگتا ہے ؎

کتنے ہونٹوں کا لمس یاد رہے
ایک بھی نقش دیر پا نہ ملا

انیسویں صدی کے آخری دنوں میں آرتھر سائمنز ARTHUR SYMONS ایک نظم میں کہتا ہے:

جب میں نے تمھاری خاطر اس کو چوما
تو میرے لب تمھارے نام کی سسکی لے رہے تھے

آرتھر سائمنز اپنی نارسائی کو یوں بہلاتا ہے کہ اگرچہ میں نے کسی اور کا بوسہ لیا لیکن یاد تجھے ہی کر رہا تھا یا اپنی بے راہ روی اور بے وفائی کا جواز یوں ڈھونڈتا ہے کہ میں نے کسی اور لڑکی کو چوما لیکن تیری خاطر اور تیرا نام لے کر روتے روتے چوما۔ بہرصورت، عشق میں اب وہ استقامت نہیں جو اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ پریم کمار نظر جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں وہ آرتھر سائمنز جیسی بھی ایمان داری کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن آرتھر سائمنز سے زیادہ مضبوط دل والا ضرور ہے۔ لہٰذا وہ دوسری لڑکی کو چومتے وقت اپنی مبینہ اصلی معشوقہ کو روتا نہیں، بلکہ صاف محسوس کرتا ہے کہ اب کوئی نقش پائدار ہی نہیں تو شاعر کیا کرے۔

ہم نے آواز نہ دی ہوگی اسے
اس نے بھی مڑکے نہ دیکھا ہوگا

دونوں تجربے موجود لیکن موہوم ہیں، کیوں کہ لوگ نہ جانے کیا سوچ کر (مجبوراً نہیں، بلکہ سوچ کر) لوگوں کو بھول بھی جاتے ہیں ؎

وہ مجھے بھولنے والا تو نہ تھا
جانے کیا سوچ کے بھولا ہوگا

پریم کمار نظر سطحی جذباتیت سے اکثر دامن بچالیتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں ایک طرح کی کلاسیکی توانائی اور وقار نظر آتا ہے جو انھیں معاصر غزل گویوں میں نمایاں کر دیتا ہے۔ ان کے یہاں رومانی حزن کی ہلکی سی جھلک ضرور ہے، لیکن عشقیہ شاعری کی جو سمت انھوں نے نکالی ہے اس میں حزن سے زیادہ نیم تلخ مایوسی کارفرما ہے۔ تمام جدید شاعری اپنی شعریات یعنی زبان اور زندگی کی طرف رویے کی حد تک رومانی ہے۔ (رومانی سے مراد وہ رومانیت نہیں جس کا ڈنکا اردو کے نقادوں نے اختر شیرانی کے سہارے پیٹا ہے، بلکہ وہ رومانیت جو ایک طرح کا طرز حیات ہے اور جس کی اساس اس نظریے پر ہے کہ تخئیل سب سے بڑی حقیقت ہے۔) پریم کمار نظر کی جو شخصیت ان کی شاعری

میں جھلکتی ہے وہ اسی رومانیت سے سرشار ہے جو ایک طرف بودلیئر کو جنم
دیتی ہے تو دوسری طرف جیمس جوائس پیدا کرتی ہے، جس کا رشتہ غالبؔ
اور میرؔ دونوں کے ساتھ مضبوط ہے، کیوں کہ یہ سب لوگ آخری تجزیے
میں گاٹ فریڈ بن GOTTFRIED BENN کے اس قول کے ہم نوا نظر
آتے ہیں کہ فن، ریاست یا تاریخ سے الگ مقام پر قائم ہوتا ہے اور اصلاً
و اصولاً دنیا اسے کسی نہ کسی طرح جھٹلاتی اور دھتکارتی ہے"، اس معنی میں
کہ فن کا یہ کام نہیں کہ دنیا کے تقاضے پورے کرے، بلکہ اس کا منصب یہ ہے
کہ اپنے تقاضے پورے کرے۔ پریم کمار نظر اس نکتے سے بہ خوبی واقف
ہیں۔ اسی لئے میں ان سے پُراُمید ہوں۔

نئی دہلی

شمس الرحمٰن فاروقی

حمد

ہر اک شے سے افضل نام ترا
نکلے مُنہ سے پل پل نام ترا

لوحِ شجر پر پتّے ذات تری
بامِ اُفق پر بادل نام ترا

رنگِ شفق کی لالی دید تری
قوسِ قزح کا آنچل نام ترا

کوہ و دمن سے آئے مہک تری
گونجے جنگل جنگل نام ترا

تُو نے بکھیرے ہر سُو رنگ کئی
پھُوٹا کونپل کونپل نام ترا

برندا بن کی گلیاں کھیل ترے
رادھا کا من چنچل نام ترا

ہر سُر کی انگڑائی ذات تری
چھنکے پائل پائل نام ترا

سانسوں کی یہ ڈوری ہاتھ ترے
ہر دھڑکن ہر ہلچل نام ترا

آخر آخر آوے یاد تری
لیویں اوّل اوّل نام ترا
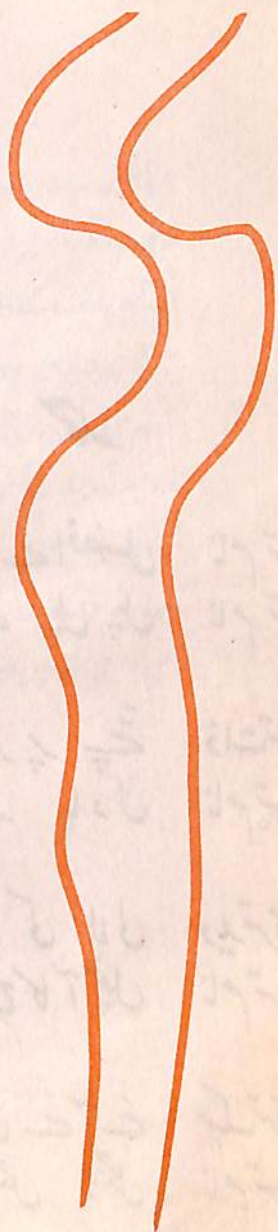
عجب دشتِ ہوس کا سلسلہ ہے
بدن آواز بن کر گونجتا ہے

یا وہ دیوار اونچی ہو گئی ہے
یا میرا قد ہی شاید گھٹ گیا ہے

گلے تک بھر گیا اندھا کنواں بھی
میری آواز پر کم بولتا ہے

میں اپنی جامہ پوشی پر پشیماں
وہ اپنی بے لباسی پر فدا ہے
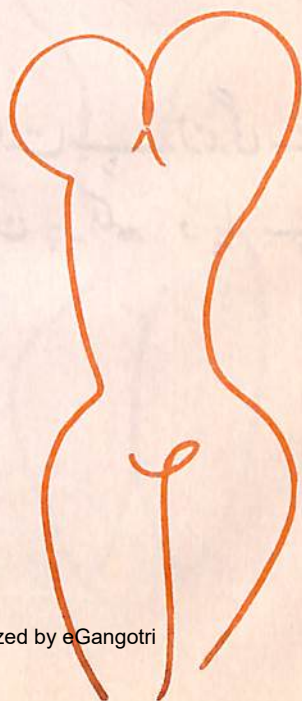
بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہیں
یہ کیسا کھُردرا بستر بچھا ہے

وہ آنکھیں ہوگئیں تقسیم دو پر
جوَاب اب اور مشکل ہوگیا ہے

وہ بہتے پانیوں پر نقش ہو گا
جو بھیگی ریت پر لکھّا ہوُا ہے

پڑھا تھا جو کتابِ زندگی سے
وہی لوحِ بدن پر لکھ دیاَ ہے

قطرہ قطرہ لُٹنے کا ایک خواب سا دیکھوں
دیر سے یہ خواہش ہے اپنا ذائقہ دیکھوں
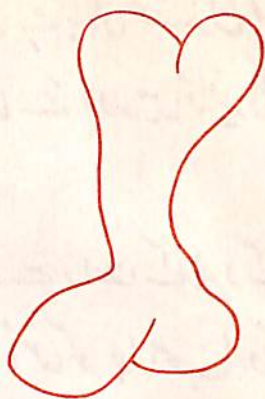
بنتے مِٹتے منظر کو آج رنگ دے جاؤں
کل کا کیا بھروسہ ہے کل یہاں ہیں کیا دیکھوں
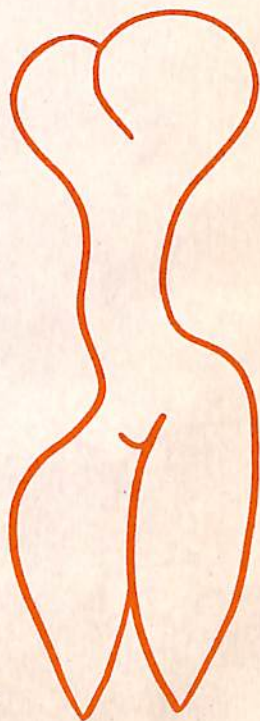
اپنے اپنے چہروں کو سب تلاش کرتے ہیں
میں کہیں نہ کھو جاؤں چل کے آئینہ دیکھوں

شاید ایسا کرنے سے کربِ ذات کم ہو جائے
آنکھ کو کھُلا رکھوں جسم کو سُلا دیکھوں

کس قدر مصیبت ہے باہمی غزل کہنا
وہ ردیف سہلائے اور میں قافیہ دیکھوں

صبح کے دریچے سے رات کے جھروکے سے
جو نظر نہیں آتا اُس کو جا بجا دیکھوں
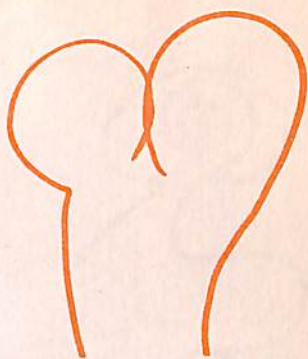
اُونٹ سب واپس پھرے آگے کوئی صحرا نہ تھا
نقشِ پا ہی نقشِ پا تھے دور تک رستا نہ تھا

اپنے اندر کتنے موسم اور باہر زردیاں
میں فصیلِ جسم میں جب تھا تو یوں پھیکا نہ تھا

پھر کھجوروں کے درختوں میں دھواں سا کس لئے
آگ جب تاپی نہ تھی اور قافلہ ٹھہرا نہ تھا

کاغذی پوشاک میں وہ گھر سے باہر جب گیا
آسماں پر ابر بن کر میں ابھی چھایا نہ تھا

ہر طرف بکھری ہوئی ریگِ ندامت تھی نظر
جسم کا چڑھتا ہوا دریا مگر اُترا نہ تھا
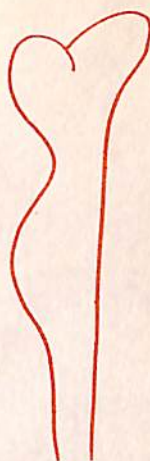
مَیں حادثہ تھا مگر قصّۂ طویل میں تھا
میرے وجود کا کنکر گرا تو جھیل میں تھا

وہ اور بھی تھا بہت کچھ مگر نہ تھا ظاہر
جو قید اپنے ہی اندر کسی فصیل میں تھا

اُبلتے خون کا رشتہ تھا سرد ہونے تک
کھُلی جو آنکھ تو سب کچھ میری سبیل میں تھا
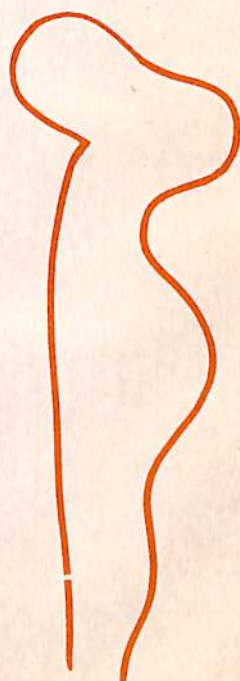
وہ شخص آج مجھے حرف حرف تول گیا
اور ایک مَیں تھا کہ آسائشِ دلیل میں تھا

یہ اور بات کہ اعمال کا بُرا تھا نظر
خلوص سب کے لئے پھر بھی اُس ذلیل میں تھا
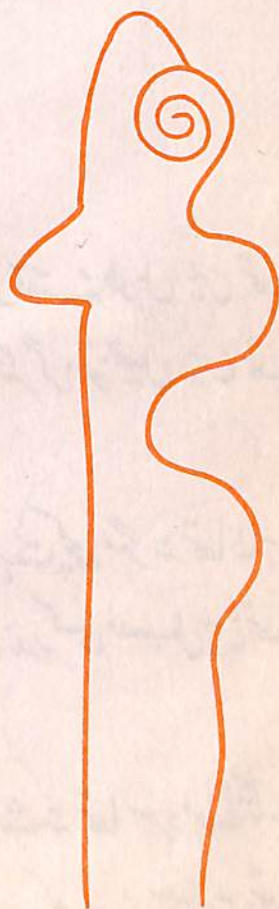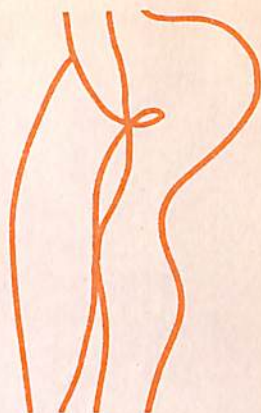
دن بھر سب سے ملتے رہے ملا کے ہاتھ
شام کو گھر لوٹے ہیں لوگ گنوا کے ہاتھ

اب مُجھ کو ہر پیچ سفر آسان ہوا
بستر باندھ کے بھیج دیا دریا کے ہاتھ

جشن سے پہلے کپڑے سلنے دے آؤ
لوگ وہاں دیکھیں گے لگا لگا کے ہاتھ

ہم پر اپنی جڑ کا تھا احسان بہت
یوں تو لاکھ سندیسے آئے ہوا کے ہاتھ

وہ تو در پر آیا تھا خیرات لئے
ہم نے خود ہی کھینچ لیا پھیلا کے ہاتھ
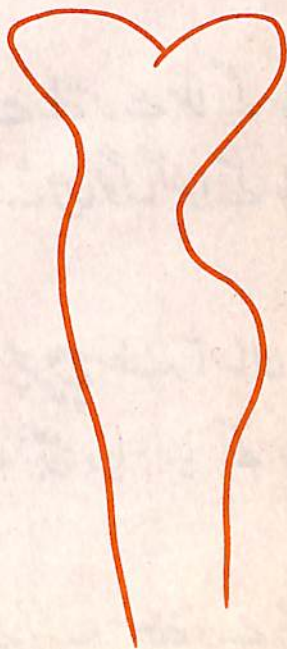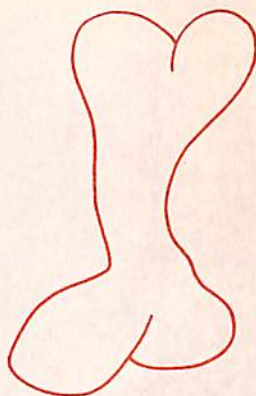
حادثہ ایسا بھی اُس کوچے میں کر جاؤں میں
کوئی کھڑکی نہ کُھلے اور گزر جاؤں میں

صبح ہوتے ہی نیا ایک جزیرہ لکھ دوں
آج کی رات اگر تہہ میں اُتر جاؤں میں

منتظر کب سے ہوں اک دستِ کراماتی کا
وہ اگر شاخ ہلا دے تو بکھر جاؤں میں

جی میں آتی ہے کہ اس دشتِ صدا سے گزروں
کوئی آواز نہ آئے تو کدھر جاؤں میں
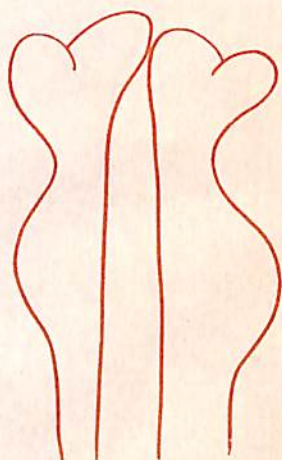
سارے دروازوں پر آئینے منقّش دیکھوں
ہاتھ میں سنگ لئے کون سے گھر جاؤں میں

مجھ کو ہر سمت سے آواز لگانے والے
حدِّ فاصل بھی کوئی رکھ کہ اُدھر جاؤں میں

ہے اختیار میں تیرے نہ میرے بس میں ہے
وہ ایک لمحہ جو اوروں کی دسترس میں ہے

وہ مُنہ سے کچھ نہیں کہتا کہ پیش وپس میں ہے
بدن کا کرب تو ظاہر نفس نفس میں ہے

اگرچہ شور بہت کوچۂ ہوس میں ہے
وہ کیا کرے کہ جو چالیسویں برس میں ہے

کرے گا کون اُسے سازشِ بدن میں شریک
جو شخص قید ابھی رُوح کے قفس میں ہے

اُٹھو کہ پھر ہمیں اذنِ سفر ملے نہ ملے
ابھی تو لطفِ صدا نالۂ جرس میں ہے

اُسے پسند کہ وہ ٹُوٹ کر گرا ، ورنہ
شجر میں کیا نہیں ہوتا جو خار و خس میں ہے
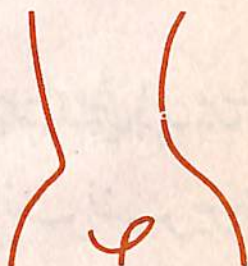
دستِ بدن میں پہلے ہوس کی کتاب دے
پھر جو بھی پوچھتا ہے وہ اُس کا جواب دے

چاروں طرف بچھائے گا پانی کی چادریں
ایسا کہاں کا وہ جو فریبِ سَراب دے

کرتا ہے جس کے سامنے دستِ طلب دراز
پچھلی نوازشوں کا تو اُس کو حساب دے

کس سے کہیں کہ جرأتِ اظہار چھِن گئی
وہ کون ہے جو پھر ہمیں لفظوں کی تاب دے
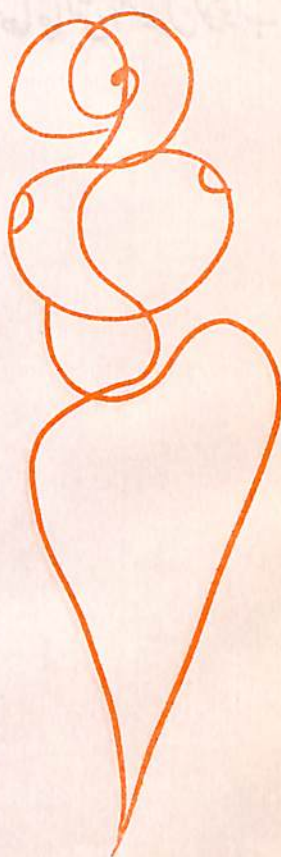
میں بھی پھلانگ جاؤں گا اِک دن فصیلِ شب
میرے بھی بازوؤں میں کوئی آفتاب دے

اب ڈھونڈ جگنوؤں سے بھری مُٹھیاں نظر
کس نے کہا تھا جاگتی آنکھوں کو خواب دے
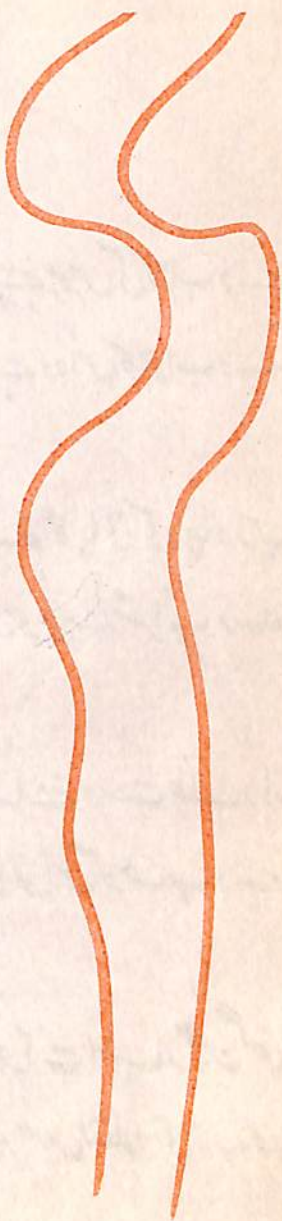
بدن کی اوٹ سے تکنے لگا ہے
وہ اپنا ذائقہ چکھنے لگا ہے

منڈیروں پر پرندے چہچہائے
پسِ دیوار پھل پکنے لگا ہے
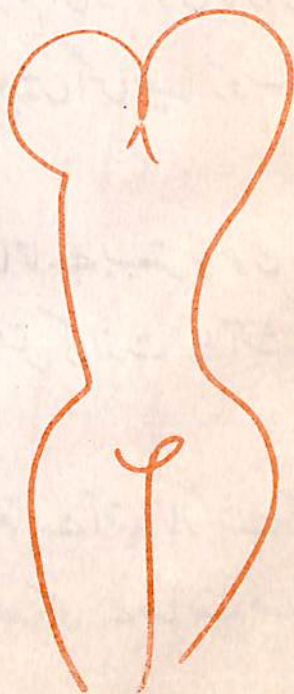
بہت لمبی مسافت ہے بدن کی
مسافر مبتدی تھکنے لگا ہے

اُسے اندھا سفر کیا راس آیا
قدم بے ساختہ رکھنے لگا ہے

غموں کا زخم بھی رشتوں کا دائرہ بھی ہے
کوئی تو شہر میں اُس جیسا دُوسرا بھی ہے

وہی دکھاتا ہے بستر پہ خون کے چھینٹے
جو شخص قتل کی لذت سے آشنا بھی ہے

اُسی پہ رکھتی ہے اُمیدِ بازگشت کہ جو
سکوتِ نجد بھی ہے صاحبِ صدا بھی ہے

بکھر نہ جائیں کہیں اب سمیٹ لو ہم کو
سُنا ہے شہر میں اندیشۂ ہوا بھی ہے

کہاں تک اُس سے چھپاؤ گے اپنا حالِ نظر
جو آنکھ رکھتا ہے وہ شخص دیکھتا بھی ہے
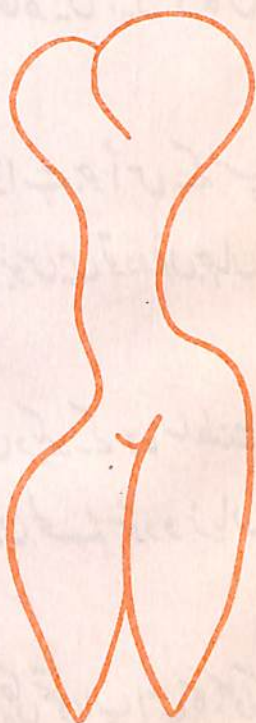
پاگل ہوا کے دوش پہ جنسِ گراں نہ رکھ
اِس شہرِ بے لحاظ میں اپنی دُکاں نہ رکھ

اُس کا دیا ہُوا ہے جو اُس کے سپرد کر
رکھنے کی اس ہَوس میں تو دونوں جہاں نہ رکھ

اُس کا زوال دیکھ کے وہ سلطنت نہ چھوڑ
اِس زندگی میں لمحۂ سُود و زیاں نہ رکھ

وہ فصل پک چکی تھی اب اس کا بھی کیا قصور
تجھ سے کہا تھا جیب میں چنگاریاں نہ رکھ

آواز کی شکست کا احسان بھی اُٹھا
بہتر یہی ہے آج سے مُنہ میں زباں نہ رکھ

وہ جسم ہے تو اس کو فقط جسم ہی سمجھ
پردا کسی فریب کا پھر درمیاں نہ رکھ

آئے گی ہر طرف سے ہوا دستکیں لئے
اونچا مکاں بنا کے بہت کھڑکیاں نہ رکھ

وہ جسم کُھل رہا ہے گرہ در گرہ نظر
یہ تیر چُوک جائے گا ڈھیلی کماں نہ رکھ

اِس درجہ زندگی سے تو پہلے لڑے نہ تھے
ہم لاکھ معتبر سہی خود سے بڑے نہ تھے

بتّی جلا کے گنتے ہیں بستر کی ہر شکن
جسموں کے مرحلے کبھی اتنے کڑے نہ تھے

فرشِ زمیں پہ لیٹ کے روئی بہت خزاں
دیکھا جب ایک پیڑ کے پتّے جھڑے نہ تھے

دیتے رہے کتاب سے یُوں تو سبق بہت
جب رن پڑا تو بھائی برابر کھڑے نہ تھے

اُس نے بھی زندگی کو تماشہ سمجھ لیا
ہم بھی کسی فریم میں پُختہ جڑے نہ تھے

گاؤں میں اب کے صبح کا منظر عجیب تھا
پیروں میں جھانجریں تھیں سروں پر گھڑے نہ تھے
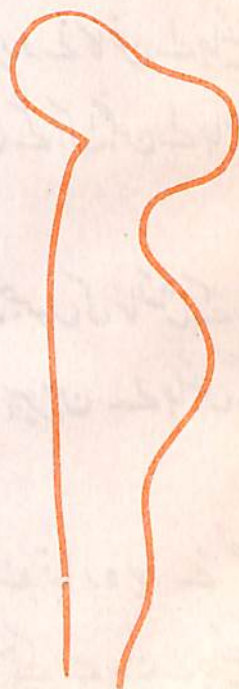
رات کے پچھلے پہر رونے کا فن لے جائیں گے
ہم جہاں بھی جائیں گے اک انجمن لے جائیں گے

لوگ جب نکلیں گے جسموں کی نمائش کے لئے
احتیاطاً ساتھ اپنے پیرہن لے جائیں گے

وہ سرِ بازار اک بندِ قبا رہ جائے گا
ہم گزرتے وقت چپکے سے بدن لے جائیں گے

کون سے رستے سے ہو کر جائے گی بادِ صبا
ہر طرف دامِ ہوس اہلِ چمن لے جائیں گے

وہ گلی گر کُوچۂ قاتل ہی ٹھہری ہے نظر
ہم بھی جب جائیں گے کاندھے پر کفن لے جائیں گے

اِس جسم کا لحاظ بھی کرنا پڑا مجھے
اندھے کنوئیں میں روز اُترنا پڑا مجھے

رکھتے ہو آج کیوں مجھے اتنا سمیٹ کر
پھر کیا کروگے کل جو بکھرنا پڑا مجھے

سائے سا ایک شخص ہے پیچھے لگا ہوُا
جس سے ہر ایک گام پہ ڈرنا پڑا مجھے

وہ کیوں ہجوم بِھیڑ کے آگے نکل گیا
میں تو سفر میں تھا کہ گزرنا پڑا مجھے

گھر سے چلا تھا سر پہ کڑی دھوپ اوڑھ کر
سایا کہیں مِلا تو ٹھہرنا پڑا مجھے

دُنیا کو میرا ایک سا چہرہ بُرا لگا
جینے کو کیا کیا رُوپ نہ بھرنا پڑا مجھے
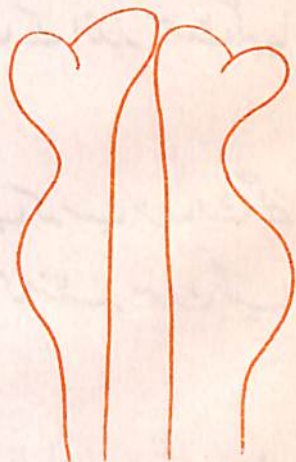
صحرا کے بازوؤں میں سمندر سمٹ گیا
ہر شخص اپنی ذات کے اندر سمٹ گیا

کھولی نہ تھی کتاب کہ سب حرف مٹ گئے
اُٹھی نہ تھی نگاہ کہ منظر سمٹ گیا

ایسا ہی کچھ اُسے تھا سکوتِ شجر پسند
ٹہنی ہلی تو شوخ کبوتر سمٹ گیا

بننے کو تھی جو شکل تو معدوم ہو گئی
کھلنے لگا جو دائرہ محور سمٹ گیا

لوحِ بدن سے لمس کے دھبے مٹا دیئے
کیسا فراخ دل تھا جو پیکر سمٹ گیا
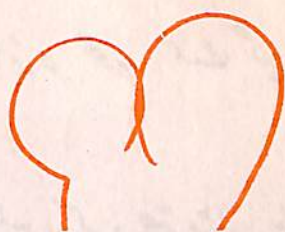
یہ زندگی تو نہ تھی مستقل عذاب کا نام
ہمیں نے خشک لبی رکھ لیا سحاب کا نام

اُترتا جائے سمندر میں سیڑھیاں بن کر
اُبھرتا آئے جزیروں کی شکل آب کا نام

مرا وجود ترے ہاتھ میں پتنگ کی ڈور
مری حیات سرِ سطح اک حباب کا نام

نظر میں گھومے ہمیشہ سے ایک ہی صورت
زباں پہ آئے سدا ایک ہی کتاب کا نام

عجیب طرح کی اندھی مسافتیں کاٹیں
کہ یاد بھی نہ رہا اپنے ہم رکاب کا نام

نگوں ہوئی نہ تھی پہلے فصیلِ شب ایسی
نواحِ جاں میں لیا کس نے آفتاب کا نام

زباں پہ ذائقہ اب اپنے ہی لہو کا ہے
کس احترام سے لیتے تھے انقلاب کا نام

گئے دنوں کا ہے اب قصہ تحفۂ خوشبو
لکھے گا کون بٹن ہول پر گلاب کا نام

چلو نظر کریں درِ مصطفیٰ پہ جا بیٹھیں
عجب نہیں کہ کھُلے ہم پہ بھی جناب کا نام

گھر سے گھر تک کا راستہ نہ مِلا
کوئی بھی خود میں جھانکتا نہ مِلا

سب کے ہمراہ سب کے سائے تھے
شہر میں کوئی دیوتا نہ مِلا

کتنے ہونٹوں کا لَمس یاد رہے
ایک بھی نقش دیرپا نہ مِلا

روشنی کے سفیر لَوٹ گئے
شہر در شہر رَت جگا نہ مِلا
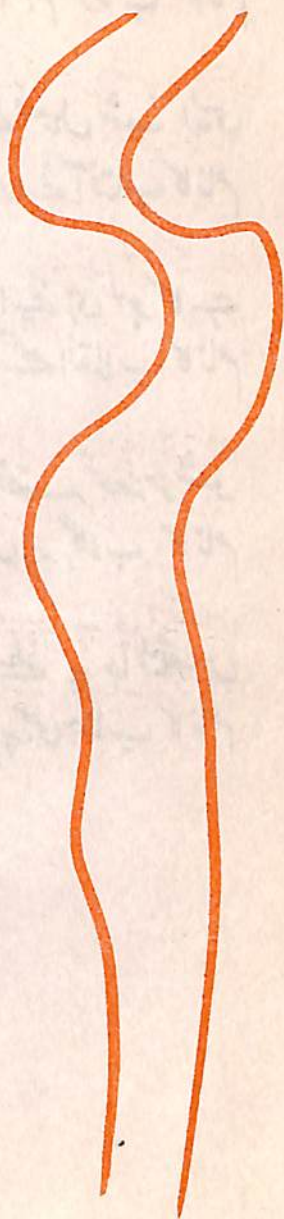
تنگ تھا ذات کا حصار بہت
کوئی رستہ فرار کا نہ مِلا

کتنے آنسو نچوڑ کر دیکھے
کھو گیا تھا جو قہقہہ نہ مِلا

ہم ہی تھے اپنے آس پاس نظر
راہ میں کوئی دوسرا نہ مِلا

اک پل کی دوڑ دھوپ میں ایسا تھکا بدن
میں خود تو جاگتا ہُوں مگر سو گیا بدن

بچّہ بھی دیکھ لے تو ٹھمک کر لپک پڑے
ایسی ہی ایک چیز ہے وہ دُودھیا بدن

جی چاہتا ہے ہاتھ لگا کر بھی دیکھ لیں
اُس کا بدن قبا ہے کہ اُس کی قبا بدن

جب سے چلا ہے تنگ قمیضوں کا یہ رواج
نا آشنا بدن بھی لگے آشنا بدن

گنگا کے پانیوں سا پوتّر کہیں جسے
آنکھوں کے تٹ پہ تیرتا ہے جو گیا بدن

بستر میں تیرے میرے سوا اور کون ہے
محسوس ہو رہا ہے کوئی تیرا بدن

دھرتی نے موسموں کا اثر کر لیا قبول
رُت پھر گئی تو ہو گیا اس کا ہرا بدن

اِس کو کہاں کہاں سے رفو کیجئے نظر
بہتر یہی ہے اوڑھیئے اب دوسرا بدن

کیا عجب چال چل گئی مچھلی
ہاتھ آئی نکل گئی مچھلی

آنچ آئے گی اب سمندر پر
بیچ پانی کے جل گئی مچھلی

ریت کا جسم کھُردرا تھا بہت
اِس لئے رُخ بدل گئی مچھلی

ساحلوں ساحلوں شمار کرو
کتنے موتی نگل گئی مچھلی
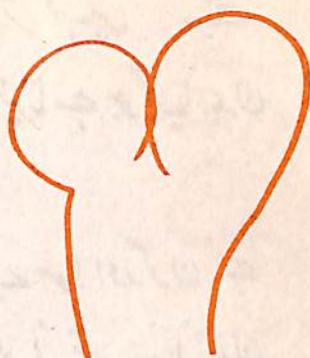
قطرہ قطرہ ٹپک گیا سُورج
لمحہ لمحہ پگھل گئی مچھلی

قلزمِ زیست ہو گیا نیلا
زہر کیسا اُگل گئی مچھلی

بیتے برس کی یاد کا پیکر اُتار دے
"دیوار سے پُرانا کیلنڈر اُتار دے"

رکھ دی ہے اُس نے کھول کے خود جسم کی کتاب
سادہ ورق پہ لے کوئی منظر اُتار دے

بھیگا ہُوا لباس بدن بھی جلائے گا
اُس سے کہو کہ سر سے وہ گاگر اُتار دے

دونوں میں ایک کو تو ملیں سُکھ کی ساعتیں
لا اپنا بوجھ بھی مِرے سر پر اُتار دے

پھر کیا کرو گے ہے تو اُسی کا بُنا ہُوا
کہہ دے اگر وہ۔ لا یہ سویٹر اُتار دے

یوں جھنجھنا کے ٹوٹتا تارا بکھر گیا
جیسے عروسِ شب کوئی زیور اُتار دے

چاہے ہے جان و مال کی جو خیریت نظرؔ
شہرِ ہوس سے دور ہی لشکر اُتار دے
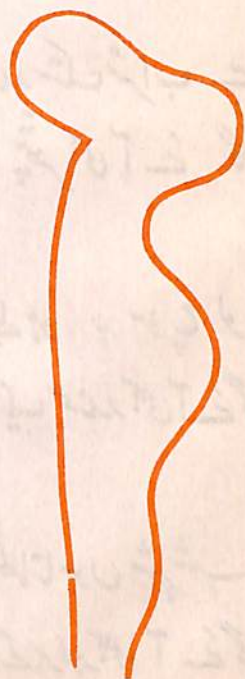
اے چشمِ سطحِ آب یہ منظر بھی آئے گا
ٹھہری رہے گی جھیل تو کنکر بھی آئے گا

یہ مان لو ہواؤں کی دستک سُراب ہے
کھڑکی کُھلی تو شور کا پتّھر بھی آئے گا

مٹی کا جسم لے تو چلے ہو، یہ سوچ لو
اس راستے میں ایک سمندر بھی آئے گا

انگلی پکڑ کے جس کو گھماتا ہوں شہر شہر
وہ شخص میرے قد کے برابر بھی آئے گا

ان جنگلوں میں رنگ کی برسات ہی نہ ڈھونڈ
یہ پیڑ جل اٹھے تو تمہیں ڈر بھی آئے گا

اس شہر کی نگاہ میں اب اجنبی سہی
لیکن یہیں کہیں پہ میرا گھر بھی آئے گا

بیٹھے رہو مکان کی دہلیز پر نظر
باہر کوئی گیا ہے تو اندر بھی آئے گا
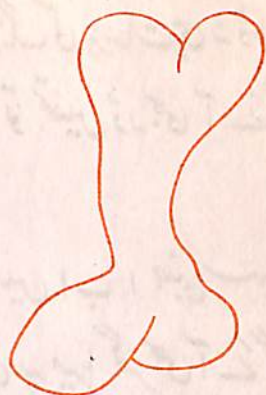
وہ نگر بے چراغ تھا بابا
کون سُنتا تری صدا بابا

آج کا آدمی بُرا بابا
جیب میں رکھ لیا خدا بابا

لوگ اک دوسرے سے ڈرتے تھے
کون دروازہ کھولتا بابا

جسم کی قید کاٹتے نہ کٹی
رُوح کو زنگ کھا گیا بابا

بہتے پانی پہ نام لکھتے ہو
یہ تمھیں ہوگیا ہے کیا بابا

خُشک پتّوں سے پُوچھیے جا کر
کس قدر تیز تھی ہوا بابا

کب ہٹے گی یہ سُست رَو مخلوق
کب کُھلے گا یہ راستا بابا

ایک دن بیٹھ کر بتا تو سہی
کیوں لیا بھیس جوگیا بابا

دے رہا ہے خبر خدائی کی
تجھ کو اپنا بھی ہے پتا بابا
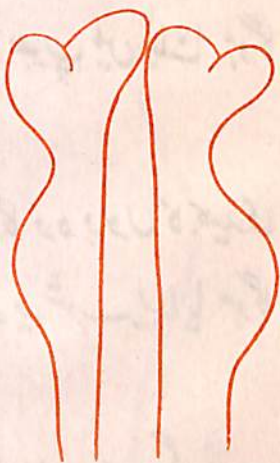
چاند نے جشن منایا ہو گا
جب کھُلی چھت پہ وہ سویا ہو گا

جب کوئی ابر نہ چھایا ہو گا
شہر کو دھُوپ میں جلنا ہو گا

کون ہو گا وہ دِلوں کا بھیدی
کِس نے یہ شہر بسایا ہو گا

ہم نے آواز نہ دی ہو گی اُسے
اُس نے بھی مُڑ کے نہ دیکھا ہو گا

وہ مجھے بھولنے والا تو نہ تھا
جانے کیا سوچ کے بھولا ہوگا

جل اُٹھا دستِ حنائی اُس کا
شعلۂ اشک کو روکا ہوگا

آپ نے جی کو لگالیں باتیں
آپ کا عشق بھی پہلا ہوگا

اُس کی بابت بھی ذرا سوچ نظرؔ
وہ بھی تیری طرح تنہا ہوگا

چلتے پھرتے لوگوں سے تو یارو اچھّی دیواریں
ہم جیسوں کو سائے بخشیں دھوپ میں تپتی دیواریں

سارے شہر پہ پھیل گیا ہے کالے جادو کا سایا
آؤ چھت پر چڑھ کر دیکھیں اب ہیں کیسی دیواریں

میرے گھر سے اگلے گھر میں روز یہی کچھ ہوتا ہے
کھڑکی ساری رات جگے گی سو جائیں گی دیواریں

دیکھو دل کا کھیل نہ کھیلو اُس بستی کے لوگوں سے
جس بستی کے چاروں جانب ہوں انسانی دیواریں

تیرا میرا جنم جنم کا ساتھ تو ہے لیکن پیارے
رُوحوں کو کب ملنے دیں گی یہ جسمانی دیواریں

کوئی کسی کی بات نہ سمجھے کوئی کسی کا نام نہ لے
میرے شہر کے لوگ ہیں جیسے چلتی پھرتی دیواریں

کل جس گھاس پہ ہم بیٹھے تھے آج وہاں پر کیا دیکھا
اینٹیں، گارہ، چُونا، پتھر ٹیڑھی میڑھی دیواریں

دنیا بھر کی تہذیبوں کا یہ کیسا انجام ہوا
ریت کے اُونچے اُونچے ٹیلے ٹوٹی پُھوٹی دیواریں

پریم کمار نظرؔ جی کب تک یُوں ہی سوگ مناؤگے
کب تک ہاتھوں پر روکو گے وقت کی گرتی دیواریں

گاؤں جاؤں تو وہ اک آنکھ نہ بھاتا ہے مجھے
میرے بچپن کی جو تصویر دکھاتا ہے مجھے

مُنہ سے کچھ کہتا نہیں دیکھتا جاتا ہے مجھے
جو سرِ شام سرِ بام بُلاتا ہے مجھے

سُونے سُونے درو دیوار سے گھبرایا ہوا
وہ نئے گھر میں ہر اک سمت سجاتا ہے مجھے

چھوڑ آیا تھا وہ گاگر سی چھلکتی آنکھیں
بارہا خواب میں پنگھٹ نظر آتا ہے مجھے

جسم آسیب زدہ گھر ہے کہ جس میں اکثر
رُوح کا بھوت سرِ شام ڈراتا ہے مجھے
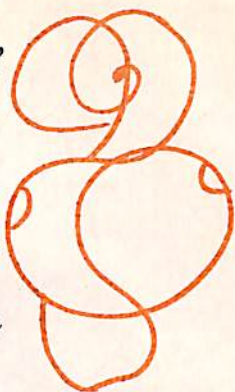
میں بھی اس کے لئے اک حرفِ غلط ہوں شاید
خود ہی لکھتا ہے مجھے خود ہی مٹاتا ہے مجھے

کوئی اُس شخص کو سمجھاؤ وہ کیا کرتا ہے
مَیں گیا وقت ہوں وہ ہے کہ بُلاتا ہے مجھے
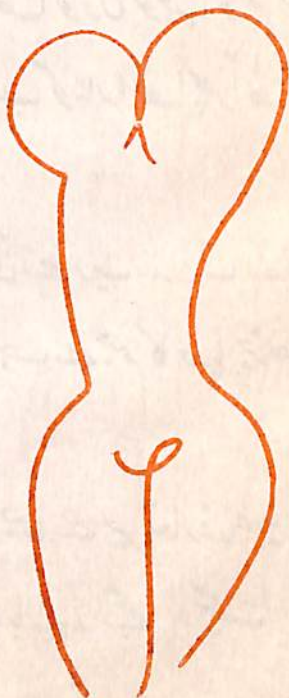
سُورج چڑھا تو دل کو عجب وہم سا ہُوا
دشمن جو شب کو مارا تھا پھر اُٹھ کھڑا ہُوا

بکھری ہوئی ہے ریت ندامت کے ذہن میں
اُترا ہے جب سے جسم کا دریا چڑھا ہُوا

اک شخص جس سے میرا تعارف نہیں، مگر
گزرا ہے بار بار مجھے دیکھتا ہُوا

جب بھی مِلا تو ہاتھ میں پتّھر اُٹھا لیا
جیسے میں اُس کے حق میں کوئی آئینہ ہُوا

نِکلا کرو پہن کے نہ یوں مختصر لباس
پڑھ لے گا کوئی لوحِ بدن پر لکھا ہُوا
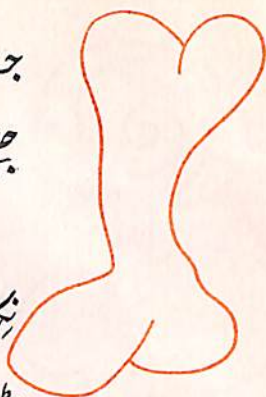
غم کی محرابوں کو تُو بھی جگمگا کر دیکھ لے
زندگی کہتے ہیں کس کو، مجھ تک آ کر دیکھ لے

میرے گھر کی چار دیواری ہی میرا گھر نہیں
دیکھنے والے کبھی اندر بھی آ کر دیکھ لے

بیندھ ڈالا دھوپ کے نیزے نے شبنم کا بدن
فرشِ گُل پر خون کے دھبّے ہیں جا کر دیکھ لے

بند کھڑکی سے الجھتی ہیں ہوا کی انگلیاں
ذہن کی تنہائی سے چادر ہٹا کر دیکھ لے

شہروں شہروں گھومیتے اب دھار بنجاروں کا بھیس
جانے کس کھڑکی سے وہ پردا ہٹا کر دیکھ لے
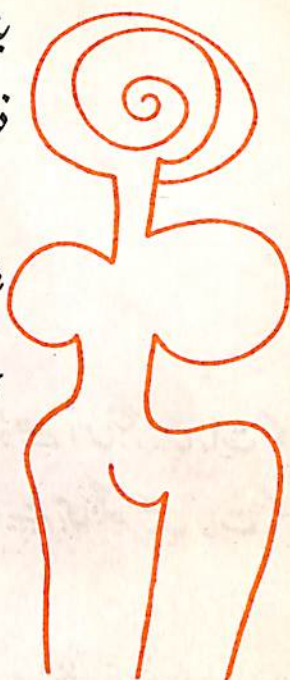
جہاں بھی شام ڈھلے اُس نگر میں رات کرو
یہ کیا ضرور کہ اپنے ہی گھر میں رات کرو

سحر کے ہوتے ہی نکلو فراغتیں لے کر
پھر ایسا ہو کہ تلاشِ سحر میں رات کرو

اُداسیوں کے کئی قافلے گزرتے ہیں
درونِ شہر کسی رہ گزر میں رات کرو

جو چل پڑے ہو تو پھر مُڑ کے دیکھنا کیسا
سفر میں دن تو گیا اب سفر میں رات کرو

تنگ ہُوا تھا جس پر اپنا گھر آنگن بھی
اُسی کی دیواروں میں نکلے ہیں روزن بھی

شہرِ تمنّا ہو گیا کیسا جادُو ہارا
ہاتھ لگے پتھر بن جائیں پھُول بدن بھی
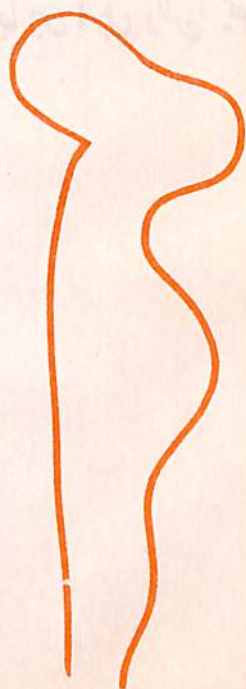
آئی ہوا اور اُڑ گئے بادل دیس پرائے
دیکھو کیسا ہرجائی نکلا ساون بھی

پیش کرو دُنیا کو یہ تصویر مکمّل
اپنے حُسن میں شامل کر لو میرا فن بھی

تِل تِل کر کے پریت نگر میں جان چلائی
اپنے حصّے کا گیلا نکلا ایندھن بھی
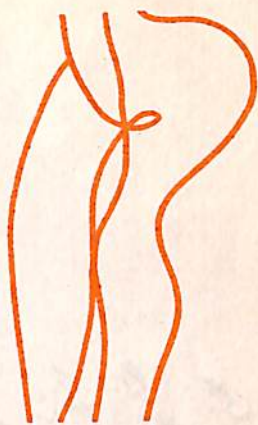
بیچ محل سے آ پہنچے ہو دروازے تک
اک دن نوچ ہی ڈالو گے تم یہ چلمن بھی

کل تک تھے دُنیا کی دیواروں پر چسپاں
آج ہمارا نام نہ جانیں اہل وطن بھی
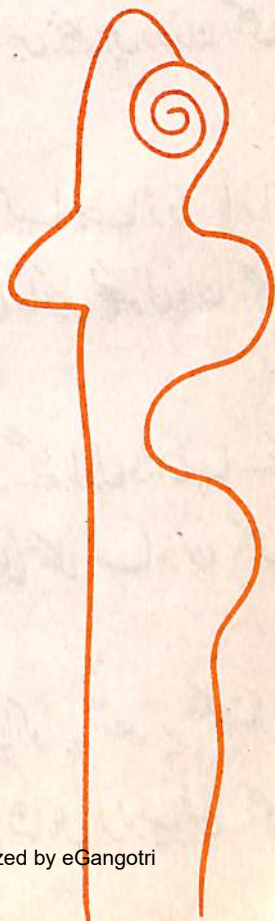
اُس طرف کیا ہے یہ کچھ کھُلتا نہیں
میرا قد دیوار سے اُونچا نہیں

دیکھ آئے اُس کو اور دیکھا نہیں
میری آنکھیں اب مرا حصّہ نہیں

سونے کو آئی سمندر پر ہوا
اور میرا بادباں کھُلتا نہیں

گُم ہیں سب اپنی صدا کے شور میں
مَیں جو کہتا ہوں کوئی سُنتا نہیں

ہم بھی اُس کو بھول ہی جائیں نظرؔ
وہ بھی ہم کو یاد اب کرتا نہیں
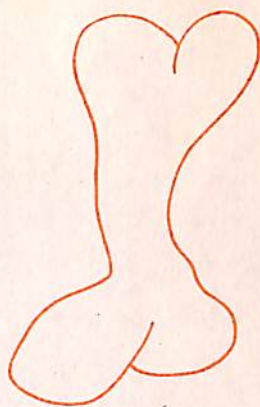
جب کبھی ہم چادر سے باہر پیر پھیلانے لگے
کچھ بزرگوں کے پُرانے قول یاد آنے لگے

گرم ہونٹوں کے شرارے یاد جب آنے لگے
جسم کی ٹھنڈک کو وہ بستر سے گرمانے لگے

یہ صدا اک بار ہی گونجے گی تیرے شہر میں
ہم تو جوگی ہیں دوبارہ کب اِدھر آنے لگے

روشنی کے شہر میں گھومے تو اندھے ہو گئے
بارہا ہم اپنے ہی سائے سے ٹکرانے لگے
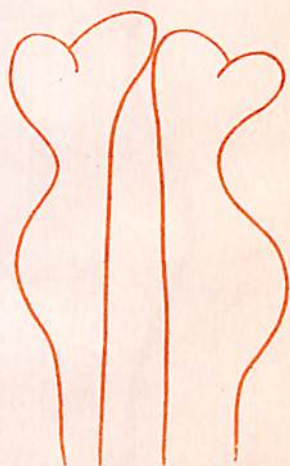
سایۂ دیوارِ دُنیا اپنی منزل تو نہیں
تھک گئے تھے چھاؤں دیکھی اور سستانے لگے

دشت سے جب شہر میں لَوٹے تو کیا دیکھا نظر
جتنے اہلِ ہوش تھے سب ہم کو دیوانے لگے

قدم قدم نہ مجھے پوچھ ایک تازہ سوال
اُداس رات کے سینے پہ اور بوجھ نہ ڈال

اُسی کے ذکر سے ہم شہر میں ہوئے بدنام
وہ ایک شخص کہ جس سے ہماری بول نہ چال

بچھڑ گیا نا وہ آخر ادھوری بات لئے
میں اُس سے کہتا رہا روز روز بات نہ ٹال

ستم گری کی نئی رسم ڈھونڈ لی اُس نے
ہمارے سامنے دیتا ہے دوسروں کی مثال

مرے خیال میں چابک پسند تھا وہ جسم
یہ کیسی بھول ہوئی کھینچ لی نہ اُس کی کھال
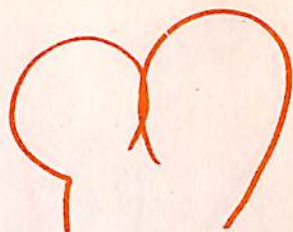
کبھی جو بیٹھ گئے جا کے دو گھڑی اُس پاس
نظر جی ڈھل گیا برسوں کا جی سے حزن و ملال
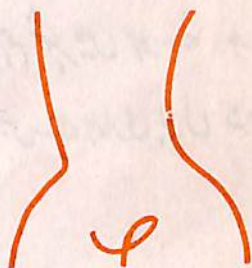
ہیں پردیسی مجھ کو اپنا رہن سہن سکھلا دے
نئی طرز کے جُوتے لے دے اور کپڑے سلوا دے

تیرے پاک پوتّر جذبے میرے نیک ارادے
کیا کہیئے کس دیس بس گئے خوابوں کے شہزادے

شاخِ ہوس پر بیٹھ کے اب تو کچّا پھل کھا جاؤں
موسمِ گل آنے پر مجھ کو شاید کوئی اُڑا دے

جس آنگن میں پھُول نہ مہکیں وہ آنگن ویرانہ
جس دیوار میں سایہ نہیں ہے وہ دیوار گرا دے

شہروں میں جا بسے ہیں ترے ہم سفر میاں
جا تُو بھی بیچ ڈال اب گاؤں کا گھر میاں

رہتے ہو کس خیال میں شام و سحر میاں
اوروں کا کچھ پتہ ہے نہ اپنی خبر میاں

بچ کر چلو کہ حرفِ ملامت ہے شاخ شاخ
پتّھر لکھے ہوئے ہیں شجر در شجر میاں

پہنا نہیں ہے ہم نے یوں ہی جو گیا لباس
کچھ بات ہے جو پھرتے ہیں یوں دربدر میاں

کھڑکی پہ سبز رنگ کا پردا لٹک گیا
آتی نہیں وہاں کی یہاں پر خبر میاں

آئے تھے پچھلے سال تو عالم ہی اور تھا
بستی میں آ گئے ہیں کہاں سے کھنڈر میاں

حق پرستی کی صدا دیتے ہو بازار کے بیچ
چُن دیئے جاؤ گے تم بھی کسی دیوار کے بیچ

چوکڑی بھرتے ہیں اس طرح سے آنکھوں کے ہرن
کوئی شے جیسے چُبھے ابروئے خمدار کے بیچ

معتدل رکھّے ہے وہ لہجے کو کیسا کیسا
غیر ہو جاوے ہے جب جاوے ہے اغیار کے بیچ

ساتھ تھے خار و خس و خاک، تو مغرور ہوا
ایک پل بھی نہ رکی محفلِ اشجار کے بیچ

دامنِ گُل سے لپٹنا تو صبا سے ڈرنا
خُشک پتّوں کے کھڑکنے کی صدا سے ڈرنا

شہرِ ترسیل میں لفظوں کا تعاقُب کیسا
راہِ بُو باس میں کیا کوہِ ندا سے ڈرنا

آنچ جب جسم کی پگھلانے لگے بندِ قبا
احتیاطاً ہی سہی، ٹھنڈی ہوا سے ڈرنا

لوحِ احساس پہ جب لِکھ ہی لیئے خارِ ہوس
پھر سفر میں نہ کسی آبلہ پا سے ڈرنا

یوں تو رکھنا بھی نظر پیاس کا احساس بہت
اور جب جھُوم کے چھائے تو گھٹا سے ڈرنا
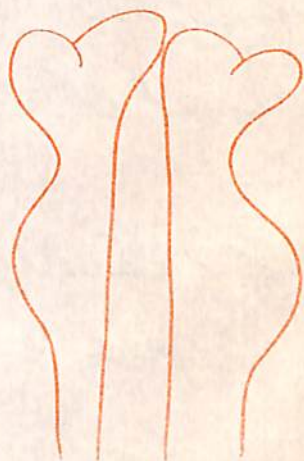
راحتیں بھی جسم و جاں کی بوجھ سی ڈھونی پڑیں
دن گئے سو کر تو راتیں جاگ کر سونی پڑیں

ہم عبث ہی شہر کے آوارہ لڑکوں میں پھرے
ساعتیں جو نیک تھیں بے کار میں کھونی پڑیں
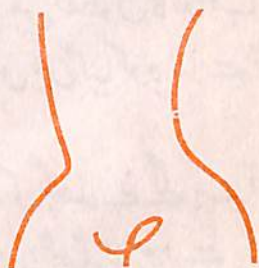
شب کو میلے پاؤں سے خوابوں کے بستر پر چلے
صبح جب سو کر اُٹھے تو چادریں دھونی پڑیں

ہم نے اپنے جسم پر بارش نہ رُکنے دی نظرؔ
کتنی فصلیں عہدِ بے آبی ہی میں بونی پڑیں
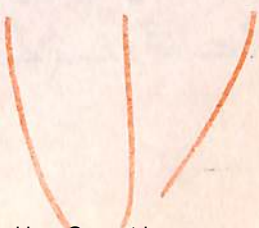
ریت میں پھول کھِلا ڈال دے جنگل میں دَھنک
ایسا اعجاز دِکھا کوئی بھی جھپکے نہ پلک

راستہ کھول مسافر پہ سحر کاری کا
پھُول قدموں میں بچھا سر پہ بصد ناز دمک

اَبر بن کر سبھی بے آب زمینوں پہ برس
دُھوپ بن کر سبھی ٹھِٹھرے ہوئے لوگوں پہ چمک

اپنے ہونے کی خبر روز اُسے دیتا رہ
اُس کے احساس میں چُبھ جسم میں کانٹے سا کھٹک

میرے لوگوں کو بھی تہذیبِ بدن سے مِلوا
تلخ لہجوں کو بدل جسموں میں بھر لوچ لچک
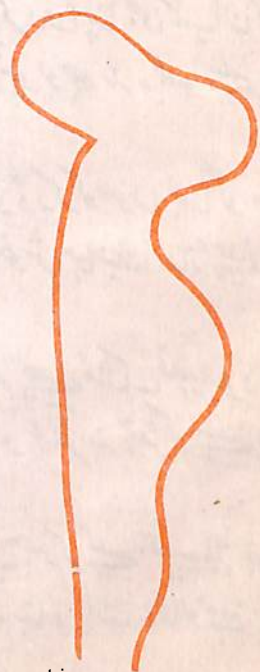
قدم قدم پر کی رُسوائی پھسلا ہر اک زینے پر
پریم گُمار نظر جی بھیجو لعنت بدن کمینے پر

اُس کی بھی مُشکل حل کر دو اپنا بھی کلیان کرو
اُس کا راز اُسی کو سونپو بوجھ نہ رکھّو سینے پر

نیلے گرم سمندر سے تو ڈر کر کوسوں بھاگو ہو
ریت میں چپُّو مار کے خوش ہو حیف تمھارے جینے پر

اپنے اندر باہر" جم جم پھیلے مُشک نصیبو دی"
چادر کا اُجلا پن بھُولو عِطر نہ چھڑکو پسینے پر

تُم کو کیا معلوم عذابِ جسم کو کیسے جھیلتے ہیں
اک دو دن میں کام بناؤ بات نہ ٹالو مہینے پر